Research Journal
Tahqeeqat
جلد:4، شمارہ:3، 2025ء
eISSN: 2791-0342
pISSN: 2791-0334
ریسرچ جرنل
تحقیقات

کاغذی گھاٹ متوسط پاکستانی عورت کے سماجی اور تانیثی شعور کی منفرد آواز

Kaaghzi Ghaat: The Unique Voice of Social and Feminist Consciousness of The Middle-Class Pakistani Women

Javeria Mehnaz
M.Phil Urdu Scholar, University of Sargodha, Sargodha

Dr. Shahid Nawaz
Associate Professor Department of Urdu Language & Literature, University of Sargodha, Sargodha

جویریہ مہناز
ایم۔فل اردو اسکالر، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا

ڈاکٹر شاہد نواز
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو زبان وادب، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا

Abstract

In Urdu Novel, women have presented in various themes and shades. Most of which, they have depicted the status of women in society and the problems of their personal and social lives. Khalida Hussain is a renowned Urdu fiction writer. In Kaaghzi Ghaat, she has depicted the social situation of women in a traditional environment in the contemporary era. Kaaghzi Ghaat, the novel presents the social status of a Pakistani educated woman who grew up after the establishment of Pakistan and her attempt to break unwanted social norms. This article describes the efforts of middle-class Pakistani women of different ages to identify themselves.

Keywords: *Khalida Hussain, Novel, Fiction, Social status, feminism, Pakistani women, Middle class, Traditional society*

کلیدی الفاظ: خالدہ حسین، ناول، فکشن، سماجی حیثیت، تانیثیت، پاکستانی عورت، متوسط طبقہ، روایتی ماحول

اردو ناول نگاری میں خواتین نے اپنے ناولوں میں مختلف موضوعات کو پیش کیا ہے۔ ان موضوعات میں اکثر انہوں نے عورت کی سماج میں حیثیت اور ذاتی زندگی کے مسائل کی تصویر کشی کی ہے۔ خالدہ حسین اردو کی مشہور فکشن نگار ہیں۔ اپنے ناول کاغذی گھاٹ میں انہوں نے معاصر عہد اور روایتی ماحول میں پروان چڑھنے والی خواتین کی سماجی صورتحال کی عکاسی کی ہے۔ کاغذی گھاٹ میں قیام پاکستان کے بعد تعلیم یافتہ پاکستانی عورت کی سماجی و تانیثی حیثیت اور ناپسندیدہ سماجی ضابطوں کو توڑنے کی کوشش کو ناول میں پیش کیا ہے۔ اس مقالہ میں متوسط طبقے کی مختلف العمر پاکستانی عورت کی اپنی ذات کی شناخت کے لیے کی جانے والی کوششوں کو کاغذی گھاٹ کے تناظر میں زیر بحث لایا گیا ہے۔

بیسویں صدی کی آخری چند دہائیوں میں خالدہ حسین نمایاں فکشن نگار کے طور پر سامنے آئی ہیں۔ افسانے اور ناول کی تخلیقی روایت میں علامتی تکنیک اور اسلوب کے حوالے سے خالدہ حسین نے اپنی منفرد آواز پیدا کی۔ خالدہ حسین خواتین کی آواز کے مختلف رنگ اپنے افسانوں میں پیش کرتی آئی ہیں۔ کاغذی گھاٹ میں انہوں نے پاکستانی عورت خصوصا قیام پاکستان کے بعد پیدا ہونے والی خواتین کی پہلی نسل کو بہت مرکزی حیثیت دی ہے۔ اس وجہ سے ان کے اس ناول کا سماجی اور تانیثی شعور کے

تناظر میں تجزیہ نئے زاویے عطا کرتا ہے۔ اس ناول میں خواتین کی جس نسل کا تذکرہ ہے، وہ متوسط طبقے سے ہے۔ یہ طبقہ سماجی اقدار اور روایات کے نام پر ابھی کھلم کھلا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ اس دور میں پروان چڑھنے والی نوجوان نسل نے تعلیم حاصل کی اور وہ آگے بڑھ کر اپنا کردار ادا کرنا چاہتی ہے، مگر ان کے لیے راستے آسان نہیں ہیں۔ سماجی مسائل اور پیشہ ورانہ ماحول ان کے آڑے آئے۔ اس سے پہلی نسل میں ان کی مائیں کسی تبدیلی کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ وہ اسی ذہنی اپروچ اور روایتی انداز کے ساتھ جی رہی ہیں۔ خالدہ حسین اسی قبیل سے تعلق رکھنے والی خواتین میں سے ہیں، جنھوں نے ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ انہوں نے ان مشکل حالات میں تبدیلی کے لیے قدم اٹھایا، جب یہ عمل تقریباً ناممکن نظر آتا تھا۔ انہوں نے اپنے تانیثی شعور کو عالمی سطح پر رائج تانیثیت کے معیار پر لانے کی کوشش کی ہے اور ان کی وجہ سے تانیثیت کو ہمارے سماج اور ادب میں بھرپور پذیرائی ملی ہے۔

کاغذی گھاٹ کا مرکزی کردار مونا ہے۔ وہ متوسط تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ پڑھی لکھی ہے اور آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ مونا اور اس کے ساتھ کی نئی پود اپنے الگ تشخص پر بھروسہ کرتی ہے، لیکن ان کو اندازہ ہے کہ ان کی سوچ اور عمل سے سماج میں کوئی تبدیلی وقوع پذیر نہیں ہوگی۔ اس کے باوجود وہ آگے بڑھ رہی ہیں۔ ان کو اپنی صلاحیتوں کا اندازہ ہے۔ وہ سماج میں اپنے بھرپور عمل کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سست رفتار تبدیلی سے بھی واقف ہیں۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو ضائع بھی نہیں ہونے دیتیں، سماج میں سست اثر پذیری سے بھی مایوس نہیں ہوتیں اور اپنی ماؤں کی طرح ایک ہی حالت پر قائم بھی نہیں رہتیں۔ انہوں نے کسی ستائش اور صلے کی پرواہ کیے بغیر اپنا مکمل کردار ادا کیا ہے۔ اس تبدیلی کے لیے اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ اس مقصد کے لیے انہیں کسی شناخت کی ضرورت نہیں تھی۔ بلاشبہ اس نسل سے تعلق رکھنے والی خواتین نے خاموش سپاہی کا کردار ادا کیا ہے:

> "بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے بعد تانیثی ادب ایک نئے دور میں داخل ہوا۔ اس سے پہلے ہی تانیثائیں اپنی شناخت کی تلاش میں اپنی داخلی دنیا کی طرف مڑ گئیں۔ خواتین ادیباؤں نے اب ایسے ادب کی تخلیق کا کام شروع کیا، جس کی جڑیں ان کے اندر کی دنیا میں پیوست ہیں۔ اس میں خود شناسی اور خود نمائی بھی کافی حد تک شامل ہے۔۔۔ ایسا لگتا ہے کہ خواتین اردو قلم کاروں نے مغربی تانیثاؤں طرح دانستہ یا نادانستہ طور پر اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ سماجی تبدیلیوں کا عمل اتنا آسان نہیں۔ اس لیے انہوں نے سماجی قدروں کو نظر انداز کر کے ایک متبادل دائرہ کار دریافت کیا ہے۔ مردوں کو ہدف ملامت بنائے بغیر انہوں نے براہ راست ان سماجی قدروں کو نشانہ بنایا ہے، جو عورتوں کو زیر اور استبداد میں رکھتی تھیں۔ انہوں نے ان ڈومینز میں بھی طبع آزمائی کی جو مردوں کے قبضے میں تھیں۔"(1)

ستر کی دہائی کی اسی نسل کو خالدہ حسین نے کاغذی گھاٹ میں دکھایا ہے۔ان خواتین نے سماجی شعور کو بہتر کرتے ہوئے تانیثی شعور پر کام کیا۔اس دوران ان کی حوصلہ شکنی بھی ہوئی۔بعض اوقات وہ ایک دوسرے کے مدمقابل بھی آئیں اورانہیں مردوں کی طرف سے مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا، مگر ان کا آگے بڑھنا جاری رہا۔وہ سماجی حالات کے پیش نظر ببانگ دہل تبدیلی کا اعلان نہیں کر سکتی تھیں، کیونکہ ان کا تعلق متوسط طبقے سے تھا،جو سماجی اقدار اور روایات کا سب سے زیادہ اسیر ہوتا ہے۔وہ اپنی روایات کو توڑے بغیر تبدیلی کا خواہشمند ہوتا ہے۔ان خواتین نے اپنا مشن جاری رکھا،یہ وہی منفرد آواز ہے۔متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ پاکستانی عورت نے سماج کے مروجہ عورت مخالف ضابطوں کو توڑنے میں ہر ممکن کردار ادا کیا۔اس دور میں اگرچہ تانیثیت کی تحریک نے اس خطے کے ادب میں بھی اپنی جگہ بنالی تھی اور خواتین نے اپنی شناخت کے لیے آواز بلند کرنا شروع کر دی تھی، مگر یہ عمل ابھی زیریں سطح پر تھا۔یہ انداز عالمی سطح پر رائج تانیثیت کی تحریکوں سے مختلف تھا۔

تانیثیت گزشتہ صدی سے ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی ہے۔اس کا بنیادی مقصد عورت کو بہ حیثیت انسان الگ وجود تسلیم کرنا اور صنفی امتیازات رد کرتے ہوئے مرد کی طرح تمام معاملات زندگی میں یکساں حقوق دینا شامل ہے۔اکیسویں صدی ترقی یافتہ ہونے کے باوجود عورت اب تک اپنے حقوق کے لیے تحفظات کا شکار ہے۔عورت کو بہ حیثیت انسان تسلیم کرنے اور دوسرے درجے کی مخلوق سمجھے جانے کا رویہ اب تک موجود ہے۔اس رویے کی بیخ کنی کرنے اور مثبت انداز میں عورت کی حیثیت متعارف کروانے کی طرف اقدامات جاری ہیں۔اس سلسلے میں تانیثیت یا فیمینزم کی توضیح ان الفاظ میں کی جاتی ہے:

> عورتوں کے خلاف منفی رویے کو تبدیل کرنا اور اور ایسے سماجی ایجنڈے پر تنقید کرنا جو غیر مساوی سلوک کو تقویت دے، فیمینزم کہلاتا ہے۔'فیمینزم' جسے اردو میں 'تانیثیت' کے نام سے جانا جاتا ہے، نسائی شعور کی بیداری کا اعلانیہ ہے۔ دور حاضر کا یہ وہ تانیثی شعور ہے جو عورت کو بحیثیت انسان تہذیبی، سماجی اور اقتصادی طور پر مردوں ہی کی طرح آزادی خیال اور ہمرہی کی وکالت کرتا ہے۔"(2)

تانیثیت موجودہ صدی میں تحریک کی صورت میں خواتین کے وسیع تر مفاد میں سرگرم عمل ہے۔دور حاضر کی ایک موثر تانیثی آواز صالحہ صدیقی تانیثیت کی تحریک کے متعلق لکھتی ہیں:

> ""تانیثیت" عورتوں کی زندگی سے متعلق تمام مسائل کا حل تلاش کرنے کے ساتھ ان کو ان کے حقوق و قوانین سے آگاہ کرانے اور انہیں مایوس کن زندگی سے نجات دلا کر ایک خوشحال زندگی کی راہ دکھانے کے لیے مشعل راہ کا کام کرنے کا دوسرا نام ہے۔یہ کسی ایک دائرے تک محدود نہیں۔ بلکہ اس کا دائرہ وسیع ہے۔"تانیثیت" صرف عورتوں کے ذریعے لکھا گیا یا عورتوں پر مردوں کے ذریعے لکھا گیا یا عورتوں کے حسن و جمال کے بارے میں لکھا گیا ادب کا نام نہیں اور نہ ہی "تانیثیت" عورت کو سڑک پر اتارنے کا نام

ہے۔ بلکہ تانیثیت کی تحریک عورتوں کی زندگی سے متعلق تمام جہتوں اور ان تمام پہلوؤں کا مطالعہ ہے خواہ وہ ان کے مسائل کے متعلق بات کرنے کو لے کر ہو یا ان کے مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کو لے کر ہو۔۔۔ ہمیں تانیثیت کو اپنے ملک و ماحول کے مطابق سمجھنے اور جاننے کی ضرورت ہے۔"(3)

معاصر عہد میں تانیثیت کی تعریف تبدیل ہوئی ہے۔ فہمیدہ ریاض کے مطابق تانیثیت کے حقیقی معنی کچھ اس طرح ہیں:

"فیمینزم ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا مطلب لوگ اپنی اپنی طرح سمجھتے رہتے ہیں مگر میں نے جب بھی اسے استعمال کیا ہے یا کہا ہے کہ "میں فیمینسٹ ہوں" تو ہر بار میرے ذہن میں اس کا یہی مطلب رہا ہے کہ عورت کے مکمل انسانی وجود کو تسلیم کیا جائے اور اس کے کسی بھی پہلو کو کچل کر نابود کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔۔۔ عورت انسان کا نسوانی روپ ہے۔"(4)

تانیثیت کی درج بالا تعریفوں سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ تانیثیت کی رو سے عورت اپنا مقام خود متعین کرنا چاہتی ہے یا کم از کم ایسا ماحول چاہتی ہے، جس میں اس کی شناخت متعین ہو اور اس کے وجود کو بہ حیثیت انسان پہچانا جائے۔ تانیثیت پسندوں میں مرد و خواتین دونوں شامل ہیں۔ تمام مفکرین اپنے اپنے انداز میں اس کی تشریح و توضیح کرتے ہیں۔ معاصر عہد میں دیکھا جائے تو تانیثیت پسندوں کی فکر اور رویوں کے مطابق تانیثیت کی مختلف اقسام وجود میں آئی ہیں۔ یہ اپنی اپنی فکر کو فروغ دے رہے ہیں مثلاً بنیاد پرست تانیثیت، انتہا پسند تانیثیت، ہم جنس پرست تانیثیت، مارکسی تانیثیت وغیرہ۔ یہ تمام مفکرین حالات اور ضرورت کے مطابق خواتین کے حقوق اور دیگر مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ تانیثیت کی تحریک کی ابتدا میں خواتین کے سیاسی و معاشی حقوق کی بازیافت کے لیے جدوجہد کی جاتی رہی ہے۔ اس کے بعد ذاتی اور سماجی سطح پر خواتین کی صنفی برابری کا تصور سامنے آیا ہے۔ خواتین کی مخصوص صنفی ذمہ داریوں کو سامنے لایا گیا۔ ان کی جنسی آزادی اور استحصال کے خاتمے پر زور دیا گیا۔ مرد مخالف رویے بھی سامنے آئے۔ ان میں سے کچھ تانیثی رویے جارحانہ اور انتہا پسند سوچ کے حامل ہیں۔ یہ درست ہے کہ حیاتیاتی پہلو سے خواتین مردوں سے مختلف ہیں۔ تخلیقی سطح پر کچھ ذمہ داریاں صرف انہی کے لیے مخصوص ہیں، لیکن سماجی طور پر مرد اور عورت دونوں کا وجود ضروری ہے۔ کائنات کی کہانی میں مرد و زن کا یکساں کردار ہے۔ کائنات انسان کے بغیر اور مرد و عورت کا وجود ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہے۔ عورت کسی بھی طرح سے کم اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ کئی جہات سے وہ مرد سے مختلف ہے، مگر اپنی الگ حیثیت رکھتی ہے۔

خالدہ حسین کے ناول میں نسوانی کردار مردوں سے براہ راست کہیں بھی برسرپیکار نظر نہیں آتے۔ بلکہ جارحانہ انداز اختیار کیے بغیر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ کاغذی گھاٹ صرف ایک بیانیہ ہی نہیں بلکہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایک جامع نقطہ نظر پیش کرتا ہے۔ ناول میں مونا کے علاوہ عائشہ اور افروز کے کردار متوسط طبقے کی پاکستانی عورت کے تین مختلف روپ ہیں۔ مونا روایتی نظام کا نمائندہ کردار ہے، جو ایک طرف روایات کی پاسدار اپنی دادی، نانی اور ماں کے طرز حیات کو بچپن سے دیکھتی

ہے، جن کی زندگیوں میں اپنے شوہروں کی شخصیات کا سحر طاری رہا۔ ان کی عمریں اپنے شوہروں سے محبت اور وفاداری کرتے گزریں۔ وہ کسی بھی طرح کے حالات میں صبر و تحمل کا دامن تھامے رہیں، مگر حرف شکایت زبان پر نہ لائیں۔ یہ عورتیں اپنی ذات کی شناخت اور پہچان سے ناواقف تھیں یا انہوں نے اپنے حالات کو تقدیر سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ وہ نسل در نسل اس عمل سے گزر رہی تھیں، مگر اپنے لیے تبدیلی کی خواہش نہیں رکھتی تھیں۔ تاہم مونا کی والدہ اپنی بیٹیوں کی اعلی تعلیم کی خواہش مند تھیں۔ ان کے خیال کے مطابق تعلیم سے اعتماد پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے شوہر کے شانہ بشانہ چل سکتی ہیں۔ مونا ان سب خواتین کے طرز عمل کی گواہ ہے اور ان سے متاثر ہے، مگر وہ حالات بدلنے پر قادر نہیں ہے۔ اس دور میں متوسط طبقے میں عام پریکٹس یہ تھی کہ جاگیر دارانہ روایتی ماحول میں سماجی معیار کو بہتر کرنے کے لیے لڑکیوں کو اعلی تعلیم دی جاتی تاکہ ان کی شادیاں بڑے گھرانوں میں اعلی افسران سے کی جاسکیں، مگر یہ صرف تعلیم کی حد تک تھا، ماحول تبدیل نہیں ہوتا نہ تبدیلی کی اجازت دی جاتی ہے۔ نہ لڑکی کو مونا کی طرح الگ سوچ پر کوئی پذیرائی ملتی ہے، بلکہ زیر بار کیا جاتا۔ لگے بندھے نظام سے ہٹ کر سوچنے پر وہ خود کو غیر محفوظ تصور کرتی۔ ایسے حالات میں مونا کا نقطہ نظر ہے کہ نظام کو توڑنا ضروری نہیں، اس میں تبدیلی بھی لائی جاسکتی ہے۔ جس حد تک تبدیلی سے اعتراض پیدا نہ ہو، کوشش کی جاسکتی ہے۔ تاہم اپنی شناخت کے حوالے سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جاسکتا:

> "اس سلسلے میں میں کسی کی بات ماننے والی نہیں۔ میں بہت کمزور۔ بہت بزدل سہی مگر لکھنے کے معاملے میں کسی کی نصیحت سننے کی قائل نہیں۔ جو میرا جی چاہے گا کروں گی۔ ہو سکتا ہے کہ کسی دن مجھ پر انکشاف ہو کہ میں بٹ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔"(5)

دوسری طرف گھر سے باہر مونا بالکل الگ ماحول سے برسرپیکار ہے۔ تعلیمی اداروں کا ماحول اور ہم جماعت دوستوں کے انقلابی خیالات اسے کچوکے لگاتے۔ وہ اس کے روایتی خیالات اور گھریلو ماحول کا مذاق اڑاتیں، احساس کمتری میں مبتلا کر کے تبدیلی پر اکساتیں۔ ناول میں مونا دو انتہاؤں پر مبنی خیالات کی وجہ سے کشمکش کا شکار ہے۔ اس کا کردار ستر کی دہائی کی اس عورت کی نمائندگی کرتا ہے، جو روایات کو ختم کر کے اپنے تہذیبی ورثے سے عاری بھی نہیں ہونا چاہتی اور نئی سوچ کو خود پر اثر انداز ہونے سے بھی نہیں روک سکتی۔ وہ ماحول سے ایک حد تک گریزاں ہو سکتی تھی مگر اپنے پرکھوں کی روایات سے فوری اور مکمل انحراف ممکن نہ تھا۔ دوسری طرف اپنے وجود کی شناخت کے لیے اپنے اندر کی آواز سے بھی بے خبر نہ تھی۔ اس کے لیے ان دو مختلف حالات میں رہنا ایک امتحان ہے مگر اس نے اپنا یہ کردار خوب نبھایا:

> "بس اور کچھ نہیں۔ وہ صرف اپنا اثبات چاہتی تھی۔ اور اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایک بھی شخص ایسا نہ تھا جو اس کو باور کرا سکے کہ وہ موجود ہے اور برحق۔۔۔ کیا ہر شخص کے دل میں شورش یہ ہنگامہ محشر نہیں اٹھتا۔ اسے معلوم تھا ان سب باتوں کو یہاں۔ اس گھر میں اور شاید پورے معاشرے میں۔ یا مڈل کلاس

معاشرے میں نہایت غیر ضروری اور نامناسب سمجھا جاتا ہے۔۔۔ مگر یہ کتابیں اور لکھنا لکھانا۔ اب بہت اہم ہو گیا تھا کہ اسے لگتا صرف لکھنا ہی اس کے وجود کا جواز ہے اس کے علاوہ کوئی بھی وجہ میری اس زمین پر موجود ہونے کی نہیں ہو سکتی۔"(6)

تقسیم کے نتیجے میں مہاجرین نے جہاں اپنی تہذیب اور قیمتی ورثے کو کھویا۔ وہیں متوسط طبقے نے اپنے سماجی حالات کو بدلنے کی کوشش کی۔ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین اپنی نوجوان نسل کو اعلی تعلیم سے آراستہ کر کے اپنے خاندانی پس منظر پر بھی پردہ ڈالنے میں کامیاب ہوئے۔ خصوصا لڑکیوں کے بہتر مستقبل کی خاطر انہیں اعلی سوسائٹی کے رہن سہن اور معیار کے مطابق تربیت کی۔ عائشہ متوسط طبقے کی ایسی ہی ایک عورت ہے جس کی تربیت امیر گھرانوں کے طرز زندگی کے مطابق کی گئی۔ وہ پر تعیش زندگی کی خواہش رکھتی ہے۔ یہ خواہش کچھ ایسی غلط بھی نہیں مگر ستر کی دہائی میں ہمارے سماج میں عورت کے حوالے سے اتنی آسانی کی گنجائش نہیں تھی۔ عائشہ کو اس طرز زندگی کے لیے قیمت چکانا پڑی۔ اس کے شوہر حسیب کا رویہ بظاہر معزز مگر نودولتیے افراد کی مثال ہے، جو اپنی خواہش اور مرضی کو ترجیح دیتے ہیں۔ عائشہ اپنی شناخت اور پہچان کھو کر پر آسائش زندگی حاصل کرتی ہے۔ عائشہ نودولتیے نظام کے جبر کا شکار ہوئی۔ کم وضع دار اور جاگیر دارانہ خاندانی پس منظر رکھنے والا اس کا شوہر حسیب مرد غالب سماج کی واضح مثال ہے، جو عورت کے خاندانی پس منظر کو عزت دینا تو کجا اس کی شکل وصورت میں بھی اپنی مرضی کے خلاف تبدیلی کا روادار نہیں۔ گویا عورت کے لیے مرد غالب سماج میں من چاہی زندگی کا حصول اپنے وجود سے دستبردار ہونا ہے۔ عائشہ کی مثال متوسط طبقے کے عورت کے اس رجحان کی نمائندگی کرتی ہے۔ ستر کی دہائی کا پاکستانی سماج عورت کو پر آسائش زندگی اور پہچان ایک ساتھ دینے کا روادار نہ تھا۔ اس دور میں ایسی خواہش رکھنے والی خواتین کو اپنے تہذیبی ورثے اور شناخت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ عائشہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"میں ایک مضبوط باوقار خوشحال اور گلیمرس زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ یہ میری کمزوری صحیح شاید میری تربیت ہی اسی طرح ہوئی تھی مگر دیکھا جائے تو ہمارے معاشرے میں عورت کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے۔۔۔ جب حسیب نے انکشاف کیا کہ وہ اپنی محبوب شے پر مکمل دسترس اور مکمل ملکیت کا قائل ہے۔۔۔ سو میں نے اپنے اصل وجود کا ایک ایک نقش مٹا دیا۔ حسیب نے جو کہا وہی کیا۔۔ مونا۔۔ یہ مانا کہ ہمارے بڑے معصوم اثاثے تھے۔۔ طلعت محمود کے گیت اور شاہی قلعہ اور جارج ایلیٹ اور چیخوف اور گورکی۔ ایک سے ایک نادر شے پڑی تھی مگر اس میدان عمل میں وہ ناکارہ جنس ہے۔"(7)

افروز عائشہ سے بالکل متضاد کردار کی مالک ہے۔ مہاجر پس منظر رکھنے والی افروز کو انقلاب کے لیے جدوجہد کرنے والا مزاج وراثت میں ملا ہے، مگر سماج کو ایسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ افروز، تہذیب و روایات سے بے زار اور فرسودہ نظام سے نالاں ہے۔ وہ کچھ کر گزرنے کا عزم رکھتی ہے۔ کاغذی گھاٹ میں افروز کا کردار ایسی متوسط پاکستانی عورت کی نمائندگی کرتا ہے، جو

تہذیب و روایات سے ہٹ کر زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ اسے عائشہ کی طرح آرام و آسائش سے غرض نہیں ہے، بلکہ وہ سماج میں انقلابی تبدیلی لانے کے لیے خود بھی عملی طور پر شریک ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لیے اپنے مستقبل کی بھی پروا ہ نہیں کرتی۔ اپنی زندگی کا فیصلہ خود کر کے نظام بدلنے کی دھن میں ایک کامریڈ سے شادی کر لیتی ہے، مگر وہ پریشان ہے کہ اس کے کسی اقدام سے ماحول میں کوئی انقلاب نہیں آیا۔ اس دور میں کسی متوسط طبقے کی لڑکی سے ایسے بہادر اقدام کی امید کرنا مشکل تھا، مگر ترقی پسندی اور مارکسی نظریات کے اثرات اس کردار میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ خصوصا عورت کے حوالے سے اس کے نظریات مصنفہ کے تانیثی شعور کی آواز ہیں:

> "میں اسی لیے اس معاشرے کو سرے سے جلا دینے کی قائل ہوں جس میں عورت کی گھٹی میں اپنی عزت نفس قربان کرنا ڈالا جاتا ہے کیونکہ اسے اپنے گھر کو بچانا ہے۔ گھر جو اس کی واحد پناہ گاہ ہے۔۔۔ ایک بہت بڑا طبقہ بیوی کو پاؤں کی جوتی قرار دیتا ہے کہ ایک پسند نہ آئی یا اس نے تنگ کیا تو دوسری پہن لی۔۔ یہی وہ تہذیبی روایات ہیں جن کی پاسداری کرتے کرتے ہماری نوے فیصد عورتیں وقت سے پہلے مر جاتی ہیں اور جب تک زندہ رہتی ہیں روحانی طور پر کس قدر تنہا ہوتی ہیں۔ مگر ہم لوگ صرف ایک گھر اور اس کے وسیع سلسلے پر سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتی اور نہ ہی کروں گی۔"(8)

پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ لسانی مسائل نے زور پکڑا۔ زبان کسی قوم کے لیے ایک حساس مسئلہ ہے۔ مشرقی پاکستان کے المیے میں لسانی مسائل اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ معاصر عہد کے مسائل میں خواتین کا شعور مردوں سے کسی طور کم نہیں تھا۔ شاہ جہاں مردوں کی بہادری کو چیلنج کرنے والا ایسا ہی ایک اہم کردار ہے۔ شاہ جہاں قومی سطح پر درپیش حساس لسانی مسائل کے حل کے لیے اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ اس دور میں جبکہ خواتین گھر سے اکیلے نکلنے پر خود کو غیر محفوظ تصور کرتی تھیں۔ کراچی یونیورسٹی کی اس طالبہ نے زبان کے مسئلے پر سندھ سے پنجاب کا سفر کیا، تاکہ زبان کو جغرافیائی حدود سے پہنچنے والے نقصان سے بچایا جاسکے۔ مصنفہ نے نوجوان نسل کی قومی یکجہتی کے لیے کوششوں اور قومی مسائل میں دلچسپی کے پہلو کو اجاگر کیا ہے۔

خالدہ حسین نے کاغذی گھاٹ میں متوسط طبقے کی ابھرتی ہوئی نسل کے تین متنوع سوچ کے حامل نمائندہ کردار پیش کر کے اس سماج کی تعلیم یافتہ عورت کے خیالات کی کسی حد تک تصویر پیش کی ہے۔ یہ لڑکیاں یونیورسٹی کی طالبات ہونے کی وجہ سے اس دور کی بھی نمائندگی کرتی ہیں اور آنے والے دور میں بھی عورت کے لیے فکر و عمل کی ایک راہ متعین کرتی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد سامنے آنے والی پہلی نسل میں عورت کئی حوالوں سے اپنا کردار ادا کر رہی ہے۔ وہ عائشہ کی طرح صرف اپنے سماجی معیار کی بہتری کے لیے بھی کوشش کرتی ہے۔ افروز اور شاہ جہاں کی طرح نظام میں تبدیلی کے لیے میدان میں اترتی ہے۔ مونا کی طرح

روایت کو بھی بچانا چاہتی ہے اور نظام کی خامیوں پر نظر رکھتے ہوئے اس کی بہتری کے لیے فکر مند بھی ہے۔ یہ عورت اپنے سماجی پس منظر سے واقف ہے۔ اکثر اوقات اس کی کوششیں بیکار ہو جاتی ہیں مگر وہ کوشش جاری رکھتی ہے۔ وہ اپنا بھرپور کردار ادا کرتی ہے۔

خالدہ حسین نے کاغذی گھاٹ میں تانیثی و سماجی شعور سے متعلق نئے پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ ناول کے تمام نسوانی کردار کسی نہ کسی طرح سماجی اور تانیثی شعور کے حامل ہیں۔ عورت کے کردار سے متعلق سوال اٹھاتے ہیں۔ ستر کی دہائی کے پاکستانی سماج میں متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ خواتین کی طرف سے کی گئی یہ کوششیں اگرچہ عالمی سطح پر رائج تانیثیت کے معیاروں کے مطابق نہیں ہیں۔ انہوں نے کم ترین سطح پر رہتے ہوئے بھی اپنی شناخت کو استعمال کیا ہے۔ یہی ان کی انفرادیت ہے۔ انہوں نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ تانیثی شعور یہی ہے کہ آپ بغیر الجھے، آگے بڑھتے ہوئے اپنا مقام بنا سکتے ہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اپنی سماجی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے مرد مرکز سماج کی بنیادوں کو اکھاڑنے کی بجائے بنیادوں کو کمزور کرنا زیادہ دیرپا اثر رکھتا ہے۔ یک لخت شناخت کا حصول ممکن نہیں، مگر یہ سفر جاری رہ سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔ خواتین اردو ادب میں تانیثی رجحان (مغربی تانیثیت کے پس منظر میں)۔۔۔ ترنم ریاض
https://www.facebook.com/share/p/1BCTrsQ8AK/
2۔ سیما صغیر، ڈاکٹر، تانیثیت اور اردو ادب، روایت، مسائل اور امکانات، (نئی دہلی: براؤن بک پبلی کیشنز، 2018ء)، ص15
3۔ صالحہ صدیقی، ڈاکٹر (مرتب)، تبصرہ: اردو ادب میں تانیثیت کی مختلف جہتیں، (لاہور: کتابی دنیا، اردو بازار، 2021ء)
4۔ فہمیدہ ریاض، "فیمینزم اور ہم"، مشمولہ فیمینزم اور ہم، مرتبہ: فاطمہ حسن، (کراچی: وعدہ کتاب گھر، 2005ء)، ص32
5۔ خالدہ حسین، کاغذی گھاٹ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2005ء)، ص166
6۔ ایضا، ص157۔158
7۔ ایضا، 190۔191
8۔ ایضا، ص147۔148

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Roman Havalaj

1. Feminist Trends in Women's Urdu Literature (In the Background of Western Feminism)... Tarnam Riaz
https://www.facebook.com/share/p/1BCTrsQ8AK/
2. Seema Sagheer, Dr., Feminism and Urdu Literature, Tradition, Problems and Opportunities, (New Delhi: Brown Book Publications, 2018), p. 15

3. Saleha Siddiqui, Dr. (compiler), Commentary: Different Dimensions of Feminism in Urdu Literature, (Lahore: Kitabi Dunya, Urdu Bazaar
, 2021)
4. Fahmida Riaz, "Feminism and Us", included in Feminism and Us, edited by Fatima Hassan, (Karachi: Wadee Kitab Ghar, 2005), p. 32
5. Khalida Hussain, Paper Ghat, (Lahore: Sangmail Publi cations, 2005), p. 166
6. Ibid., p. 157-158
7. Ibid., p. 190-191
8. Ibid., p. 147-148